ابراہیم خلیل اور اسوۂ ابراہیمی

مولانا ابوالکلام آزادؒ

"پھر جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام دونوں اللہ تعالیٰ کے آگے جھک گئے اور ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کے لیے ماتھے کے بل گرا دیا تو ہم نے پکارا: اے ابراہیم! بس کرو تم نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیک بندوں کو ان کے اثارِ نفس اور فدویتِ نفس و جان کا بدلہ دیا کرتے ہیں، بے شک یہ ایک نہایت کھلی ہوئی ظاہری نمائش تھی اور ذبحِ اسماعیل کے فدیہ میں ہم نے ایک بہت بڑی قربانی (یعنی سنت ابراہیمی کی یادگار میں تا قیامت جاری رہنے والی قربانی) دے دی اور تمام آنے والی امتوں میں اسی واقعہ عظیمہ کے ذکر کو قائم کر دیا، پس سلام ہو راہِ الٰہی میں اپنی قربانی کرنے والے ابراہیم خلیل پر" (وَالصّٰفّٰتِ: ۱۰۳ تا ۱۰۹)

ٹھیک اب سے ۵۲۴۳ برس پیشتر دنیا کے ایک گوشے میں کیا عجیب وغریب انقلاب ہو رہا تھا، ایک ہولناک اور وحشت انگیز بیابانِ ریگ زار تھا، جس کی مہلک ریگ اور خشک سرزمین میں ہر طرف موت وہلاکت پھیلی ہوئی تھی، ایک یکسر "وادی غیر ذی زرع" تھی یعنی ایسی سرزمین جہاں زراعت وفلاحت کا نام ونشان نہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں فرمایا تھا کہ "الٰہی! میں نے اس بیابان مکہ میں اپنی اولاد لا کر بسائی ہے، جہاں زراعت کا نام ونشان نہیں، پس "غیر ذی زرع" اس آیت سے ماخوذ اور اس کی طرف اشارہ ہے، جس کی سطح بے نمونہ پر زندگی کی سبزی وشگفتگی کا نام ونشان تک نہ رہا تھا، لیکن اب "رب السموات والارض" کے دو مخلص بندے تھے، جنہوں نے انسانی زندگی کے لئے، اس بیابان وحشت کے لیے، فلاحت وزراعت کے لیے اسی سرزمین خشک سال کو اور خدائے واحد کی پرستش وعبادت کے

لیے اس صحرائی قربان گاہ کو منتخب کیا، ان کے دونوں طرف صحرائے وحشت تھا، مگر ان کے اوپر وہ خدائے حکیم وقدیر تھا جو آبادیوں کا بخشنے والا اور زمینوں کی وراثت تقسیم کرنے والا ہے، ان کے ہاتھ میں پتھروں کے ٹکڑے تھے، جن کو ایک دیوار کی صورت میں جمع کرتے جاتے تھے اور زبان پر دعائیں تھیں، جو ادھر زبانوں سے نکل رہی تھیں اور ادھر قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا فیصلہ ہو رہا تھا:

''الٰہی! ہمارے ہاتھ تیری پرستش اور تیرے جلال وقدوسیت کے نام پر جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس کو قبول کرلے، بے شک تو ہی دعاؤں کا سننے والا اور عملوں کا دیکھنے والا ہے، الٰہی! ہم کو اپنا مسلم اور اطاعت شعار بنا اور پھر ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی ہی امت پیدا کر جو ہماری طرح مسلم ومؤمن ہو، الٰہی ہم کو اپنی عبادت وبندگی کے مقبول طریقے بھادے اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر کہ تو ہی بڑا درگزر کرنے والا اور تو ہی اپنے عاجزوں پر مہربان ہے، الٰہی! ہماری اس دعا کو بھی ان گھڑیوں میں قبول کرلے کہ جو قوم ہماری نسل سے پیدا ہو ان میں اپنا ایک ایسا برگزیدہ رسول بھیجنا جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، علم وحکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفوس وقلوب کی اصلاح کرے، الٰہی! ان تمام باتوں کا تجھی کو اختیار ہے اور تیری ہی تدبیر اور تیری ہی حکمت اصلی حکمت ہے''۔ (البقرۃ: ۱۲۷ تا ۱۲۹)

اللہ اکبر! وہ کیا وقت تھا جب کہ صدیوں اور ہزاروں برسوں کا فیصلہ چند لمحوں اور منٹوں کے اندر ہو گیا، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ یہ دعائیں ان زبانوں سے نکل رہی تھیں جن میں سے ایک راہِ الٰہی میں اپنے جذبات اور ارادے کی قربانی کر چکا تھا اور دوسرا اپنے جان ونفس کی، دونوں نے اپنی محبوب ترین متاعوں کو راہِ الٰہی میں لٹا دیا تھا، ایک نے اپنے فرزندِ عزیز کو اور دوسرے نے اپنی جانِ عزیز کو، دونوں مجاہد فی سبیل اللہ تھے اور اس لیے دونوں مسلم تھے، خدا نے ان دونوں کی دعاؤں کو قبول کیا اور اس طرح قبول کیا کہ دنیا کے ۵ ہزار برس کے حوادث و انقلابات بھی ان کی قبولیت کی صداقت کو دھبہ نہ لگا سکے، وہ چند پتھروں سے چنی ہوئی چار دیواری جس کے چاروں طرف انسانی ہستی کی کوئی علامت نہ تھی، کروڑوں انسانوں کی پرستش گاہ اور قبلہ وجود بنی اور خدا کے جلال وقدوسیت نے تمام عالم میں صرف ان کی چھت کو اپنا نشین بنایا۔ داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کا وہ عظیم الشان ہیکل جس کو ہزاروں انسانوں کی سالہا سال کی محنت ومشقت نے لمبے لمبے ستونوں اور گنبدوں کا شہر بنا دیا تھا، چند صدیوں تک بھی زندہ نہ رہ سکا اور وحشی حملہ آوروں نے بارہا اس کی عظیم الہیبت دیواروں کو غبار بنا کر اڑا دیا، لیکن چند پتھروں سے چنی ہوئی اس چار دیواری کے گرد دعائے ابراہیمی نے ایک ایسا آہنی حصار کھینچ دیا تھا کہ ۵ ہزار برس کے اندر انقلاباتِ ارضیہ وسماویہ نے سمندروں کو جنگل اور انسانی آبادیوں کو سمندروں کے طوفان کی صورت میں بدل دیا، لیکن آج تک اس کی بنیادوں کو کوئی حادثہ اور مادی قوت صدمہ نہ پہنچا سکی، یہاں تک کہ تاریخ عالم میں وہی ایک سرزمین ہے جس کی نسبت تاریخ دعویٰ کر سکتی

ہے کہ اس کی مقدس اور محترم خاک آج تک غیر قوموں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے محفوظ و مصون ہے:

''کیا ہماری اس قدرت کی نشانی کو لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم مکہ کو (جو ایک غیر معروف بے رونق خطہ تھا) امن و حفاظت کا گھر بنا دیا اور ایک عالم نے اس کے گرد ہجوم کیا۔ پھر کیا لوگ باطل پر ایمان لاتے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جھٹلاتے ہیں''۔ (العنکبوت:۶۷)

اور اگر کسی قوم نے اس کی عزت و احترام کو مٹانا چاہا، تو خدائے قدوس کی دست کبریائی نے خود اس قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا:

''اے پیغمبر! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے پروردگار نے اس لشکر کے ساتھ کیا سلوک کیا جو ہاتھیوں کا ایک غول لیکر مکہ پر حملہ آور ہوا تھا؟ کیا خدا نے ان کے تمام داؤ غلط نہیں کر دیے؟ اور ان پر عذاب کی نحوستوں کے غول نازل نہیں کیے، جنہوں نے ان کو سخت بربادی میں مبتلا کر دیا، جو ان کے لیے لکھ دی گئی تھی، یہاں تک کہ وہ پامال شدہ گھاس کی طرح تباہ ہو گئے''۔

یہ اسی دعا کے پہلے ٹکڑے کی قبولیت تھی، باقی دو التجاؤں کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے قبولیت بخشی، اس کی صداقت بھی اس بیتِ خلیل کی صداقت سے کم نہیں:

''بے شک اللہ تعالیٰ نے بڑا احسان کیا کہ (دعائے ابراہیمی کو قبول فرما کر) انہی میں سے ان کی طرف اپنا رسول بھیجا، جو ان کو احکام پڑھ کر سناتا ہے، ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو علم و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ سخت جہل و گمراہی میں تھے''۔ (آلِ عمران:۱۶۴)

قرآنِ کریم میں ایک بڑا حصہ انبیائے صادقین کے قصص و اعمال کا ہے، اس کا عام اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ پہلے ایک خاص تعلیم پیش کرتا ہے اور اعمال انبیاءِ سابقہ کے حالات و واقعات سے ایک خطابی استدلال کرتا ہے تاکہ امت مرحومہ کے سامنے تعلیم اور اس کے عملی نمونے اور نتائج دونوں موجود ہو جائیں۔ لیکن تمام قرآن میں اگر مسلمانوں کے سامنے کوئی کامل زندگی اور کسی زندگی کے از سرتا پا اعمال بطورِ نمونہ پیش کیے گئے ہیں اور ان کے اتباع کی دعوت دی گئی ہے تو صرف دو نمونے ہیں، خود شریعتِ اسلامیہ کے داعی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی نسبت (سورۂ احزاب) میں فرمایا کہ:

''بے شک رسول اللہ کی زندگی تمھارے لیے (کہ اللہ اور یومِ آخرت سے ڈرتے رہو اور کثرت کے ساتھ اس کا ذکر کرنے والے ہو) پیروی و اتباع کے واسطے ایک نمونہ ہے''۔

اور پھر ملتِ حنفی کے داعیِ اول حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی نسبت ارشاد ہوا:

''بے شک تمھارے لئے کہ اللہ اور یومِ آخرت سے ڈرتے رہو، ان لوگوں کی زندگی میں ایک بہترین نمونۂ عمل ہے اور جو شخص اس کی طرف سے منہ موڑے تو اللہ تعالیٰ انسانوں کے اعمال کا محتاج نہیں ہے''۔ (الممتحنۃ:۶)

میں نے ہمیشہ سے اس امر پر غور کیا ہے کہ: (۱).....تمام قرآن کریم میں بیسیوں انبیائے سابقین کے حالات و اعمال بیان کیے گئے ہیں، لیکن کسی کی تمام زندگی کو بطورِ نمونہ کے مسلمانوں کے سامنے پیش نہیں کیا ہے الّا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی۔ (۲).....تمام قرآن میں ''اسوۂ حسنہ'' کا لفظ صرف تین مقامات میں آیا ہے: اول سورۂ احزاب میں آنحضرت ﷺ کی نسبت اور پھر سورہ ممتحنہ میں دو مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت، اس کی علت کیا ہے؟ سورہ احزاب اور سورہ ممتحنہ دونوں سورتیں زیادہ تر احکامِ جہاد و قتال فی سبیل اللہ اور بعض مقامات کے نتائج و دور ابتلاء آزمائش و عجائباتِ نصرتِ الٰہیہ کے بیان سے مملو ہیں، پھر یہ دونوں آیتیں جن رکوعوں میں آئی ہیں وہ بھی تمام تر ذکر جہاد پر مبنی ہیں، ضرور ہے کہ اس میں بھی کوئی علت ہو۔ دونوں مقامات میں پوری مماثلت حتیٰ کہ اشتراک جزئیات بیان بھی موجود ہے، سورہ احزاب میں اس آیت کا وہ موقع ہے جہاں جنگِ احزاب یا جنگِ خندق کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے، جو اپنی تین ہزار کی جمعیت مقابلہ میں حملہ آوروں کی بارہ ہزار مسلح اور متحدہ قوت دیکھ کر گھبرا اٹھے تھے، پھر اس نصرتِ الٰہیہ کا حوالہ دیا ہے، جس نے محصورین کو کامیاب کیا اور تمام حملہ آور ناکام و خاکسر واپس ہو گئے۔

بعینہٖ یہی حال سورہ ممتحنہ کے پہلے رکوع کا ہے، فتح مکہ سے پیشتر جب آنحضرت ﷺ نے چڑھائی کا ارادہ کیا تو حاطب ابن ابی بلتعہ نامی ایک صحابی تھے، جن کے اہل و عیال مکہ میں موجود تھے، انہوں نے پوشیدہ طور پر ان کو اطلاع دی کہ تحفظ کا انتظام کر رکھیں، وحی الٰہی سے آنحضرت ﷺ پر منکشف ہو گیا اور آدمی دوڑا کر وہ خط راہ سے واپس منگایا، اس پر یہ سورہ نازل ہوئی:

''مسلمانوں! ان کافروں اور دشمنانِ اسلام کو اپنا دوست نہ بناؤ یہ ہمارے اور تمہارے دونوں کے دشمن ہیں، (یہ کیسی بات ہے کہ) تم ان سے نامہ و پیام جاری رکھتے ہو؟ حالآنکہ تمہارے پاس جو حق و صداقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی وہ اس سے انکار کر چکے ہیں۔'' (الممتحنۃ:۱)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے اسوۂ حسنہ کی طرف اسی رکوع میں توجہ دلائی گئی ہے، پھر آیات متعلق حرب و قتال و تشویق جہاد فی سبیل اللہ میں اس ''اسوۂ حسنہ'' کی طرف اسی رکوع میں توجہ دلانے کی کیا ضرورت تھی؟ اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم اسلام کی جس حقیقت کو دنیا کے آگے پیش کرنا چاہتا تھا، اس کے لحاظ سے اگر کوئی زندگی ''اسوۂ حسنہ'' ہو سکتی تھی تو وہ صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی تھی، اسلام ایک صداقت ہے اور اس لیے دنیا میں اس وقت سے موجود ہے، جس وقت سے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں صداقت ہے، لیکن اس صداقتِ مبین کو ایک شریعتِ الٰہیہ کی صورت میں سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش کیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے ان کو ہر جگہ ملتِ حنفی کے اولین واعظ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بتلائی ہے کہ:

''جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ان کے پروردگار نے کہا کہ (سچے فرمانبردار) ہو جاؤ، تو انہوں نے کہا کہ

میں اسلام لایا تمام جہانوں کے پروردگار کے لیے"۔(البقرہ:۱۳۱)

چوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسلام کے پہلے داعی تھے، اس لئے ان کا وجود یکسر پیکرِ اسلام تھا اور اپنے عملِ حیات کے اندر اسلام کی حقیقت کا ایک عملی نمونہ رکھتے تھے، وہ اسلام کے واعظ تھے اور واعظ کے لئے اولین شے یہ تھی کہ تعلیم کے ساتھ خود اپنی زندگی کا عملی نمونہ بھی پیش کردے اور جن حقیقتوں کی طرف دنیا کو دعوت دیتا ہے ان کو سب سے پہلے اپنے اوپر طاری کردے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان حقائق کو اپنے اوپر طاری کیا، اس لئے ان کا ہر عمل صدائے اسلام تھا اور وہی پیروانِ اسلام کے لئے عملی نمونہ یا "اسوۂ حسنہ" ہوسکتا تھا اور یہی سبب ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ان کی زندگی کے تمام اعمال ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیے اور ان کے ذکر کو بقائے دوام عطا فرمایا۔

دنیا کے بڑے بڑے کشور ستانوں، عظیم الشان ذاتوں اور خشکیوں اور سمندوروں پر حکمرانی کرنے والی قوموں کو ہم آثارِ قدیم کے کھنڈروں، بوسیدہ قبروں، قومی روایتوں اور تاریخ کے کہنہ اوراق میں ضرور دیکھ سکتے ہیں، مگر تمام مجمع اولین و آخرین میں ایک انسانی ہستی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے اعمالِ حیات صفحوں اور مٹی کے ڈھیروں میں نہیں، بلکہ کروڑوں انسانوں کے اعمال کے اندر سے اپنی حیات کا ثبوت دے سکتے ہوں، ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو دنیا کے سامنے "اسوۂ ابراہیمی" کی لازوال زندگی کا یہی عجیب منظر ہوتا ہے جب کہ تاریخ کئی ہزار برس آگے بڑھ کر لوٹتی ہے تاکہ اسلام کے داعیِ اول کی زندگی کو ایک بار پھر دہرادے، لاکھوں انسانوں کا مجمع ہوتا ہے، جس میں ہر وجود پیکرِ ابراہیم علیہ السلام بن جاتا ہے اور "مقام خلت" کی سلطنت تعین اور تشخص کو فنا کرکے اس پورے مجمع کو ایک "ابراہیم خلیل" کی صورت میں نمایاں کردیتی ہے:

"اور ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو اپنی رحمت میں سے بڑا حصہ دیا اور ان کے لئے اعلیٰ و اشرف (طریق) ذکرِ خیر دنیا میں باقی رکھا۔" (مریم:۵۰)

آج ذوالحجہ کی نویں تاریخ ہے جبکہ یہ سطور قلم سے نکل رہے ہیں، چشمِ تصور سے دیکھئے تو آپ کے سامنے بندگانِ مخلصین کا ایک شہر آباد ہے، لاکھوں انسان ایک ہی لباس اور ایک ہی صدا کے ساتھ ایک ہی کے لئے دوڑ رہے ہیں، بے شک "ابراہیم خلیل" کا وجود تنہا دنیا میں باقی نہیں رہا، لیکن ان لاکھوں عاشقانِ الٰہی میں سے ہر عاشق اس عاشقِ اول کے فیضانِ عشق سے مستفیض نہیں ہے۔ اگر ہے تو یقین کیجئے کہ خلیل اللہ آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا جب کہ میدانِ "حج" میں لاکھوں مسلمانوں کی زبانوں سے صدائے "لبیک اللھم لبیک" نکلتی ہے، تو اس ایک ہی ابراہیم خلیل کی صدا ہوتی ہے، جس نے اب سے پانچ ہزار برس پیشتر اپنے دوست کی صدائے "یا عبدی" کے جواب میں عاشقانہ محویت کے ساتھ "لبیک" کا نعرہ لگایا تھا، وہ ایک ہی وجود کے اندر کب تھا جو فنا ہوجاتا؟ وہ اپنے اندر ایک پوری طاقت رکھتا تھا، اس لئے آج بھی اپنی امت کی صورت میں موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔ ☆☆